پروفیسر محمد رفیق چوہان

شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی کی شاعری میں

حمد و ثنائے ربِّ جلیل

سندھ کے عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا صوفیانہ کلام اپنی معنوی گہرائی، سلاستِ بیان اور بے ساختگیٔ اظہار کی خصوصیات کی بنا پر ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی مقبولیت اور پذیرائی میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس میں پوشیدہ نت نئے معانی اور مطالب و مفاہیم سے دنیا آشنا ہو رہی ہے۔ سندھ کے عوام شاہ لطیف کی شاعری کے لیے جذباتی والہانہ پن اور عقیدت و احترام رکھتے ہیں۔ وہ شاہ کی بیان کردہ منظوم داستانیں اور کافیاں ایک گونہ خوشی اور فریفتگی کے عالم میں گاتے اور گنگناتے ہیں۔ شاہ کے عارفانہ کلام میں اعلیٰ شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کا شاندار استعمال بھی ہے اور اعلیٰ و ارفع متصوفانہ نظریات اور اخلاقی تعلیمات کا ماہرانہ اظہار بھی ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ یہ تمام کسی قسم کی دقیق اور پیچیدہ اصطلاحات میں نہیں بلکہ عام روزمرہ زندگی کے معمولات، مسائل اور ضروریات کے مطابق نہایت سادہ اور آسان الفاظ میں بیان کر دی گئیر ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شاہ لطیف کا کلام عوام و خواص دونوں کو یکساں متاثر کرتا ہے۔

مختلف مذاہب اور علاقوں سے تعلق رکھنے والے صوفیا میں ان وابستگیوں کے اختلاف کا اثر ان کے بعض رجحانات اور اعمال و وظائف پر ضرور پڑتا ہے، لیکن ایک بات جو ان سب میں مشترکہ طور پر پائی جاتی ہے، وہ خالقِ حقیقی سے ان کی والہانہ محبت اور قربِ الٰہی کے لیے ان کی شدید لگن ہے۔ شاہ عبداللطیف کے ہاں بھی خدا سے محبت کے تصور کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دراصل ان کا سارا کلام محبوبِ حقیقی کی عظمت و رفعت کا اعتراف اور قربِ الٰہی کے حصول کی جدوجہد کے مختلف مرحلوں کا بیان ہے۔ اکثر و بیشتر صوفی شعرا نے اپنے عارفانہ مشاہ

وتجربات کو استعاروں اور تشبیہوں کی زبان میں ادا کیا ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ماورائے طبیعاتی حقائق کو بعینہٖ ادا کرنے کی اہلیت کسی بھی انسانی زبان میں بدرجۂ کمال نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا مجبوراً ان حقائق کو بیان کرنے کے لیے استعاروں اور تشبیہوں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ شاہ لطیف نے بھی اپنی صوفیانہ واردات وتجربات کو استعاراتی انداز میں مختلف لوک کہانیوں کے جستہ جستہ واقعات اور کرداروں کی روشنی میں بیان کیا ہے۔ لیکن اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو قاری جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ لوک کہانیاں یا کردار بذاتِ خود شاہ لطیف کی دلچسپی کا مرکز نہیں ہیں، جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ان کی کسی بھی نظم کو مثنوی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے کلام میں کوئی لوک داستان اپنی جزئیات سمیت مکمل صورت میں نہیں ملتی۔ درحقیقت ان کا اصل مقصود یہ تھا کہ ان کہانیوں کے اہم واقعات اور کرداروں کی روشنی میں خدا اور بندے کے باہمی تعلق کی روحانی کیفیات کو بیان کر دیں۔ بقول ایلسا قاضی "یہ ضمنی واقعات اور روایتی داستانیں جنھیں لطیف نے استعمال کیا ہے، محض وہ کھونٹیاں ہیں، جن پر وہ اپنے الہیاتی موضوعات کو آویزاں کرتے ہیں۔ حسنِ مجازی کی مدد سے وہ قاری کے دل میں خدا سے وصال کی تڑپ پیدا کرتے ہیں اور خدا ہی ان کی نظموں کا اصل محبوب ہے۔" ایچ۔ ٹی سورلے بھی اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ "محبت شاہ لطیف کے لیے محض خدا تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔" اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شاہ کا سارا کلام خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے مختلف اسرار و رموز کے گرد گھومتا ہے۔ تاہم اگر ایمائیت اور استعاراتی انداز سے قطع نظر صرف ایسے اشعار کے لیے "شاہ جو رسالو" کی ورق گردانی کی جائے جن میں براہِ راست اور بلا واسطہ انداز میں حمد وثنائے ربِ جلیل بیان کی گئی ہے تو اس صورت میں بھی ہمیں بے شمار ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں معانی و مطالب کی گہرائی اور سلاستِ بیان کی منفرد آمیزش پائی جاتی ہے۔

اردو دان طبقے تک شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری کو پہنچانے کے لیے سندھ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف سندھیالوجی نے شاہ کے مجموعۂ کلام "شاہ جو رسالو" کا منظوم اردو ترجمہ "رسالۂ شاہ عبداللطیف" کے نام سے شائع کیا ہے جو سندھ کے مشہور شاعر شیخ ایاز کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں اسی منظوم ترجمے سے شاہ کے اشعار کے حوالے دیے گئے ہیں۔ رسالے

کا آغاز ہی حمد باری تعالیٰ سے ہوتا ہے جس میں شاہ لطیف بڑے سادہ اور عام فہم لیکن دل کش انداز میں اللہ تعالیٰ کی شان کریمی، ابدیت، ربوبیت، رفعت و رزاقی کے ساتھ ساتھ اس کے قیوم و عالم ہونے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

تیری ہی ذات اوّل و آخر — تو ہی قائم ہے اور تو ہی قدیم
تجھ سے وابستہ ہر تمنا ہے — تیرا ہی آسرا ہے رب کریم
کم ہے جتنی کریں تیری توصیف — تو ہی اعلیٰ ہے اور تو ہی علیم
والیٔ شش جہات واحد ذات — رازقِ کائنات، ربِ رحیم

اس کے بعد وہ عرفانِ ذات، انکشافِ حقیقتِ مطلق اور راہِ راست پر گامزن ہونے کے لیے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت اور ان کی راہنمائی کو بہت ضروری گردانتے ہیں اور اپنے قاری کو تلقین کرتے ہیں کہ اگر تم خدا پر ایمان اور اس کے رسولؐ سے محبت رکھتے ہو تو پھر کسی ماسوا کی اطاعت اور غلامی اختیار نہ کرو۔

سمائے جس میں ان دونوں کا سودا — کسی در پر نہ اس سر کو جھکاؤ

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے اختلاف پر بہت سے صوفیانہ اور فلسفیانہ مباحث کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں۔ لیکن مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے ان دونوں اصطلاحوں کے درمیان میں بڑے خوب صورت انداز میں تطبیق دی ہے۔ افادات میں مولانا تھانوی مرحوم اس سلسلے میں فرماتے ہیں ... "پس اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ گو ممکنات موجود ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے، موجود کیوں نہ ہوتے۔ مگر وجودِ حق کے رو برو ان کا وجود نہایت ناقص اور ضعیف اور حقیر ہے۔ اس لیے وجودِ ممکن کو وجودِ حق کے رو برو گو عدم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے۔ جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتدبہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی وحدۃ الوجود کے ہیں۔ کیوں کہ اس کا لفظی ترجمہ ہے، وجود کا ایک ہونا۔ سو ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ گو دوسرا ہے سہی، مگر ایسا ہی ہے جیسے نہ ہو۔ اس کو مبالغتاً وحدۃ الوجود کہا جاتا ہے۔ یہی حال وحدۃ الشہود کا ہے، جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیوں کہ اس کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا۔ یعنی واقع میں تو ہستی متعدد ہے مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور باقی سب

کالعدم معلوم ہوتے ہیں ۔ ۔ ۔ پس وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں اختلاف لفظی ہے۔ مگرچوں کہ وحدت الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے، اس لیے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا ہے۔"

خالقِ کائنات کے مقابلے میں ہر چیز کے غیر اہم ہونے یا مولانا تھانوی کے الفاظ میں "گو ہے سہی ۔ مگر ایسا ہے جیسے نہ ہو" کے اس مضمون کو شاہ عبداللطیف بھٹائی نے بہت سے اشعار میں بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے:

خالقِ حسنِ کائنات ہے خود — خود ہی اس کائنات کا محبوب
آپ ہی آپ آئینہ ہے وہ — خود ہی طالب اور خود مطلوب

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

کبھی وحدت کی تنہائی میں کثرت — کبھی کثرت کے ہنگاموں میں کثرت
مگر ان سارے ہنگاموں کی تہ میں — بس اک محبوب ہے اور اس کی صورت

وہ جس طرف بھی نگاہ اٹھاتے ہیں، انھیں جمالِ خداوندی ہی نظر آتا ہے:

قصر ہے ایک اور در لاکھوں — ہر طرف بے شمار ہیں روزن
مجھ کو ہر سمت سے نظر آیا — جلوہ گر ایک ہی رخِ روشن

اسی طرح ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں:

غیر محدود ہے جلال اس کا — دہر آئینۂ جمال اس کا

ترکِ غیر کے مرحلے میں سالک کی توجہ ہر ماسوائے حق سے ہٹ کر صرف اور صرف خالقِ حقیقی کی طرف مرکوز ہو جاتی ہے۔ ایسے میں کائنات کے کسی بھی مظہر کو اہمیت دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی آرزو رہ جاتی ہے جو ہمہ وقت اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے اور وہ آرزو قربِ خداوندی یا وصالِ حق کی آرزو ہوتی ہے:

میں تیرا عبد ہوں میرے معبود — شرک و الحاد سے مجھے کیا کام
خلش انگیز آرزو تیری — میرے قلب و نظر میں صبح و شام

تاہم شاہ بھٹائی اس بات سے بھی بہ خوبی آگاہ ہیں کہ ربِ جلیل کی ذات سے والہانہ لگاؤ

تو ہو سکتا ہے جیسا کہ ہونا بھی چاہیے لیکن تحلیلی انداز میں عقلِ متناہی کی پہنچ سے اس واجب الوجود کی ذاتِ لاانتہا ماورا ہی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ تشبیہ و استعارہ اور مثال کی مدد سے بھی اس کا قرار واقعی یا مکمل علم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ اسے اس کائنات کی کسی شے سے مماثلت یا تشبیہ نہیں دی جا سکتی:

ابتدا ہے نہ انتہا کوئی　　کیا لگائے تیرا تہہ کوئی
بے شریک و عدیل و بے ہمتا　　تجھ سا پایا نہ دوسرا کوئی

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ذاتِ بے مثال کی مطلقیت اور لاانتہا کلیت کے مقابلے میں اپنے نامکمل اور متناہی ہونے کے احساس سے انسان میں اپنی خامیوں کا شعور خوب واضح ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ بار بار اپنی خطاؤں اور لغزشوں پر جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے مالکِ کائنات کی بے کراں رحمت و شفقت پر بھی بھروسہ ہوتا ہے۔ شاہ لطیف بھی اپنی خطاؤں اور خامیوں کا اعتراف کرتے ہوئے خالقِ حقیقی کے بے پایاں رحم و کرم پر تکیہ کرتے ہیں:

میں انجان رہی، غفلت میں ساری عمر گئی بیکار　　تجھ کو خبر ہے سب کچھ پیارے، خادم ہوں میں اے ستّار
غیب کی باتیں تجھ پر ظاہر، رحم سراپا تیری ذات　　مجھ میں عیب ہزاروں لیکن تیرے کرم سے کب انکار

خدا بے نیاز ہے۔ ہمہ دم متغیر کائنات میں ہونے والے حادثات و واقعات سے اس کی ذات کو ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا۔ تاہم وہ واقعات و حوادثِ کائنات سے یکسر لاتعلق بھی نہیں ہے۔ اس کے بندے جب اپنی خطاؤں اور گناہوں کی سچے دل سے توبہ کرتے ہیں تو وہ ان کی توبہ کو قبول کرتا ہے۔ جب بندگانِ خدا آلام و مصائب میں مبتلا ہو کر اس کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہوئے دست بہ دعا ہوتے ہیں تو وہ رحیم ان کے بگڑے ہوئے کام سنوارتا ہے۔ مختصر یہ کہ خدا بے نیاز تو ضرور ہے لیکن اپنے بندوں سے بے پروا نہیں ہے:

یوں تو کہنے کو بے نیاز ہے تُو　　پھر بھی در پردہ کارساز ہے تُو
کوئی جن کا نہیں زمانے میں　　ان غریبوں کا کارساز ہے تُو

ربِ جلیل کی اسی شانِ کریمی کے پیشِ نظر شاہ عبداللطیف مشورہ دیتے ہیں:

تھام لے اس کریم کا دامن　　وہی سارے جہان کا داتا ہے

کیوں کسی کا غلام کہلائے جو فقط اس سے لو لگاتا ہے

خالقِ کائنات اگرچہ ماورائے کائنات ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کائنات پر محیط بھی ہے۔ اس کے دربار میں حاضر ہونے اور اپنی احتیاج کو پیش کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے سفر کی ضرورت نہیں ہوتی۔

گو بہ ظاہر وہ دور ہے لیکن درحقیقت قریب ہے دل سے

انسان سے خدا کی اس نزدیکی کو قرآن مجید اپنی شان دار اور معجز بیان بلاغت میں یوں ادا کرتا ہے کہ "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ" (اور ہم اس (انسان) کی شہ رگ سے بھی قریب ہیں) اس مفہوم کو شاہ عبداللطیف یوں بیان کرتے ہیں:

تیری جھولی میں ہے وہ پہلے سے رگِ جاں سے بھی ہے وہ نزدیک

ریاضتیں اور عبادتیں اپنی جگہ خوب ہیں اور بندے کا یہ فرض ہے کہ وہ یادِ الٰہی میں مصروف رہے اور تزکیۂ نفس کے لیے ریاضت و عبادت کرتا رہے لیکن اپنے زہد و تقشف پر غرور کرنے کا اسے کوئی حق نہیں اور نہ وہ یہ تصور کرنے ہی میں حق بہ جانب ہے کہ عبادات و ریاضیات کی بنا پر وہ ضرور کسی رتبۂ بلند کا مالک ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ رتبۂ بلند کا ملنا بندے کا حق نہیں بلکہ مالکِ حقیقی کی عنایت ہے:

کمی کیا ہے اسے نغموں کی مطرب تیرا نغمہ وہ کیا خاطر میں لائے
وہ پارس اور ہم سب جیسے لوہا جسے چاہے، اسے سونا بنا دے

یہی بات شاہ عبداللطیف ایک اور جگہ بارگاہِ رب العزت میں عرضِ حال کرتے ہوئے اس طرح بیان کرتے ہیں:

میں ہوں لوہا، تیری نظر پارس تو غنی، میں ہوں سائل نادار
سونا بن جائے پل میں لوہا بھی تو اگر چاہے، اے سخی سردار

رسالۂ شاہ عبداللطیف کا اختتام جس مقام پر ہوتا ہے، اس کے مندرجہ ذیل دو اشعار پر ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں:

مرحبا تیری جلوہ آرائی کارفرما ہے شانِ یکتائی
ماورائے ثنا ہے تیری ذات ذرہ ذرہ ہے تیرا شیدائی